تزکیۂ نفس

بدعت، اس کے اسباب اور اس کا علاج

(از مولانا امین احسن اصلاحی)

(سلسلۂ گذشتہ)

بدعت کی تعریف بدعت نام ہے اُس چیز کا کہ جو چیز دین کی نہیں ہے وہ دین میں لا گھسائی جائے۔ کسی چیز کے دین کی چیز ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ قرآن میں بیان ہوئی ہو، اگر قرآن میں نہ بیان ہوئی ہو تو کسی قابلِ اعتماد حدیث ہی میں آئی ہو، اگر حدیث میں بھی نہ ہو تو کم از کم قیاس و اجتہاد ہی سے یہ ثابت ہو کہ یہ بات قرآن و حدیث سے موافقت اور مناسبت رکھتی ہے۔ اگر اس طرح کا کوئی تعلق بھی اس کا کتاب و سُنت سے ثابت نہ پایا جائے تو پھر وہ بات دین کی بات نہیں ہو سکتی۔ اگر دین کے ساتھ اس کا خواہ مخواہ جوڑ ملانے کی کوشش کی گئی تو یہ بدعت ہے اور اس طرح کی ہر بدعت ضلالت اور گمراہی ہے۔

اس امر کو اچھی طرح ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس طرح کی کوئی بات بدعت اُسی صورت میں قرار پائے گی جب اس کا پیوند دین سے لگانے کی کوشش کی جائے، اگر دین سے اس کا جوڑ نہ ملایا جائے تو اس پر بدعت کا اطلاق نہ ہوگا۔ فرض کیجیے ایک شخص گانا سنتا ہے لیکن وہ اس بات کا مدعی نہیں ہے کہ یہ چیز دین کا کوئی جزو ہے یا معرفتِ الٰہی کا کوئی ذریعہ ہے تو اس کے اس فعل کو بدعت نہیں کہیں گے کیونکہ اس نے اس چیز کا جوڑ دین سے نہیں ملایا ہے۔ اس کو شریعت کے احکام کی روشنی میں جانچیں گے اور فیصلہ کریں گے کہ اس کا یہ فعل جائز ہے یا ناجائز۔ اور اگر ناجائز ہے تو کس درجہ میں ناجائز ہے۔ لیکن اگر وہی شخص اپنے اسی گانے سننے کے متعلق یہ دعوےٰ کر بیٹھے کہ یہ معرفتِ الٰہی کا کوئی ذریعہ یا تزکیۂ نفس و اصلاحِ باطن کا کوئی نسخہ ہے تو اس سے سوال ہوگا کہ اس نے کتاب و سُنت کی کس دلیل یا ان کے کس اشارہ سے یہ بات اخذ کی ہے اگر وہ کسی نص یا اشارہ کا حوالہ دے گا تو

اس کی روشنی میں اس کا فیصلہ ہوگا اور اگر وہ کوئی حوالہ نہ دے سکے بلکہ محض اپنے وجدان یا ذوق یا تجربہ کو اس کی دلیل ٹھہرائے تو یہ بدعت ہوگی کیونکہ وہ دین کے حرم میں ایک ایسی چیز گھسا رہا ہے جس کے لیے اس کے پاس کوئی سند نہیں ہے۔

یہاں سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جہاں تک دنیا کا تعلق ہے اس میں کوئی اضافہ یا ایجاد یا کوئی نئی راہ نکالنا یا نئی طرح ڈالنا بدعت کے تحت نہیں آتا۔ اس دائرے میں ہم آزاد ہیں کہ جو چاہیں اضافے کریں اور جس طرح کی چاہیں کیاں کر دیں۔ لیکن یہاں معاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام میں دین اور دنیا کی اس قسم کی کوئی تفریق ہے بھی؟ اگر ہے تو ان کے درمیان وہ حد فاصل کیا ہے جس سے ایک شخص بغیر کسی اشتباہ کے معلوم کر سکے کہ یہ دین کے حدود ہیں اور یہاں سے دنیا کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔

دین اور دنیا کے حدود اس سوال کے پہلے حصہ کا جواب تو یہ ہے کہ اسلام میں اس معنی میں تو دین اور دنیا کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے جس معنی میں عیسائیت میں ان کے درمیان تفریق ہے کہ شخصی زندگی کے ایک نہایت محدود گوشے کے سوا بقیہ ساری اجتماعی و سیاسی زندگی دین کے دائرہ بحث سے خارج ہے۔ اسلام اس پہلو سے تو ایک کلیت پسند دین ہے کہ اس نے ہماری زندگی کے ہر حصے سے بحث کی ہے خواہ وہ انفرادی ہو یا سماجی یا سیاسی۔ لیکن اس پہلو سے اس میں بھی دین اور دنیا کی تفریق موجود ہے کہ وہ ہمارے ہر گوشۂ زندگی کی ساری تفصیلات و جزئیات سے بحث نہیں کرتا بلکہ صرف ان کے چاروں گوشے متعین کر دیتا ہے۔ ان کو متعین کر دینے کے بعد ہمیں آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ ہم جس طرح چاہیں ان کے حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی رائے اور فکر کی آزادی استعمال کریں اور اپنی قوتِ ایجاد و اختراع کا مظاہرہ کریں۔

اس بات کو چند مثالوں سے سمجھیے:۔

ہماری زندگی سے ایک بڑا قریبی تعلق رکھنے والا مسئلہ کھانے پینے کا مسئلہ ہے۔ اس میں اسلام نے دخل تو دیا ہے لیکن اس دخل کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ پہلے ساری کھانے پینے کی چیزوں کی تفصیل سنائی ہو پھر یہ بتایا ہو کہ ان میں سے کیا کیا چیزیں جائز ہیں اور کیا کیا چیزیں ناجائز۔ پھر ان کے پیدا کرنے، ان کے سنبھالنے اور ان کے پکانے اور محفوظ رکھنے کی تدبیریں بتائی ہوں۔ اسلام کو ان تفصیلات سے کوئی بحث نہیں ہے۔

اس نے صرف یہ کیا ہے کہ چند متعین چیزوں کو جو حرام ہیں بتا دیا کہ یہ حرام ہیں ان کو کھانا پینا ناجائز ہے۔ اب جو چیزیں ان کے حکم میں آتی تھیں وہ آپ سے آپ ان کے تحت حرام یا مکروہ ہو گئیں۔ اس کے بعد اس سلسلہ کی ساری چیزوں کو انسان کی طلب، اس کے ذوق اور اس کی قوت اکتساب و ایجاد پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی طبعی ضرورتوں اور اپنے فطری تقاضوں کو پورا کرے۔

اسی طرح ہمارے لباس کا مسئلہ ہے۔ اس بارے میں اس نے یہ کیا کہ چند اخلاقی نوعیت کی حدیں مقرر کر دیں۔ مثلاً یہ کہ لباس ساتر ہو، مرد مسرفانہ لباس مثلاً ریشم کا استعمال نہ کریں۔ لباس سے شہدپن اور غنڈہ پن کا اظہار نہ ہو۔ مثلاً تہمد یا شلوار زمین پر گھسٹتی ہوئی یا ٹخنوں سے نیچے نہ ہو۔ عورتیں مردوں کا سا یا مرد عورتوں کا سا لباس نہ پہنیں۔ بس اس طرح کی چند شرطیں عاید کر کے ہمیں آزاد چھوڑ دیا کہ ہم جس طرح کے کپڑے چاہیں ایجاد کریں، جس طرح کے چاہیں سلوائیں، اور جس ڈھب سے انہیں چاہیں پہنیں۔ ان سارے امور کا انحصار ہمارے ملک کی آب و ہوا، ہماری قومی روایات، ہمارے فطری ذوق آرائش اور ہماری قابلیتِ اختراع و ایجاد پر ہے مذہب ان چیزوں میں کوئی دخل نہیں دیتا۔

اسی طرح ہمارا معاشرتی مسئلہ ہے۔ اس میں بھی اسلام نے چند اصول دے دیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کی بنیاد جائز رشتۂ مناکحت پر ہو۔ اس میں مرد کی قوامیت کے ساتھ عورت اور مرد دونوں کے لیے حقوق اور دونوں کے اوپر ذمہ داریاں ہوں، اولاد کی پرورش و تربیت ایک مشترک ذمہ داری ہو، اگر اس رشتہ کو توڑنے کی نوبت آئے تو وہ یونہی واقع نہ ہو جائے بلکہ طلاق، عدت، مہر اور رضاعت کے چند متعین ضوابط کے تحت ہو۔ عورتوں اور مردوں کو آزادانہ اختلاط کی اجازت نہ ہو بلکہ گھروں کے اندر بھی اور گھروں کے باہر بھی چند معلوم حدود کی پابندی کی جائے ان چند اصولی باتوں کے بعد ازدواجی زندگی کو خوش گواری کے ساتھ گذارنا اور اس اجمال میں تفصیل کا رنگ بھرنا میاں اور بیوی کا کام ہے۔ اسلام اندرون خانہ کی روزمرہ زندگی کی جزئیات میں کوئی مداخلت نہیں کرتا۔

اسی طرح ہماری سیاسی زندگی کا معاملہ ہے۔ اس کے متعلق بھی اسلام نے چند بنیادی باتیں طے کر دی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اسلام کا نظامِ حکومت خدا کی حاکمیت کے نظریہ پر مبنی ہو، اس میں قانون کا ماخذ خدا کی شریعت ہو، اس کے چلانے والے تقویٰ اور صلاحیت کے اوصاف سے متصف ہوں، جہاں شریعتِ الٰہی کی کوئی واضح ہدایت

موجود نہ ہو وہاں سارے معاملات شوریٰ کے ذریعہ سے طے کیے جائیں۔ یہ اور اسی طرح کے چند بنیادی اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک سیاسی نظام کو بنانا اور چلانا اور زمانہ کے حالات اور تقاضوں کے مطابق اس کو ڈھالنا اور ترقی دینا ہمارا اپنا کام ہے۔ اسلام ان تفصیلات میں نہیں پڑتا جو بالکل انتظامی نوعیت کی ہیں اور جن کا شعور ہر معاشرے کی فطرت کے اندر ودیعت ہے۔

یہ چند چیزیں محض بطور مثال ذکر کی گئی ہیں۔ ہمارا مقصود یہاں نہ تو تمام شعبہ ہائے زندگی کا استقصاء کرنا ہے اور نہ ان اصولوں کی تفصیل کرنا ہے جو ان شعبہ ہائے زندگی سے متعلق اسلام نے دیے ہیں۔ یہ چیزیں ہر صاحب علم قرآن اور حدیث سے اخذ کر سکتا ہے۔ ہم تو یہاں صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اسلام اگر ایک کلیت پسند دین ہے تو وہ کس معنی میں کلیت پسند ہے۔ وہ کلیت پسند تو بے شک ہے لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا اس کلیت پسندی کا مفہوم صرف یہ ہے کہ وہ ہر شعبۂ زندگی سے متعلق وہ بنیادیں متعین کر دیتا ہے جن پر اس کو مبنی ہونا چاہیے۔ یہ معنی اس کلیت پسندی کے نہیں ہیں کہ وہ اس شعبۂ زندگی سے متعلق ساری جزئیات و تفصیلات بھی بتاتا ہو۔ یہی حقیقت ہے جس کو ہمارے فقہاء اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ اصل ہر چیز میں اباحت ہے۔ یعنی ہر شعبۂ زندگی کے اندر اسلام کچھ حدود متعین کر دیتا ہے اس کے بعد ہمیں آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ ان حدود کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اپنے فکر و عمل کی وہ صلاحیتیں استعمال کریں جو ہمارے اندر ودیعت ہیں۔

حد بندی اور اباحت، پابندی اور آزادی کا یہی وہ امتزاج ہے جو اسلام کو نہ صرف دوسرے مذاہب پر فوقیت بخشتا ہے بلکہ اس کو ایک ابدی دین کا مقام عطا کرتا ہے۔ ہمارے ہر شعبۂ زندگی کو چند پابندیوں کے ساتھ یہ جو باندھ دیا گیا ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ خواہ اس پر کتنے ہی تغیرات اور حوادث طاری ہوں لیکن وہ ان حقایق سے منحرف نہ ہونے پائے جو فطرت کے اٹل حقایق ہیں۔ یہ حقایق اگر قایم ہیں تو زندگی کا ہر تغیر اسلام ہی کے تحت ہے۔ اس تغیر سے معاشرہ یا تمدن یا سیاست میں کسی فساد کے پیدا ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ حقایق اپنی جگہ پر قایم نہ رہ سکیں تو پھر ہماری زندگی اس جہاز کے مانند ہے جس کا لنگر ٹوٹ چکا ہے، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس چٹان سے جا ٹکرائے۔ اور یہ جو ایک وسیع دایرہ آزادی کا رکھا گیا ہے جس کے اندر ہم خود اپنی فکری و عملی صلاحیتیں استعمال کرتے ہیں تو یہی وہ چیز ہے جو اسلام کے اندر وہ لچک پیدا کرتی

ہے جس کی وجہ سے وہ زمانہ کے ہر اس صالح تغیر کو اپنا لیتا ہے جو اس کے بنیادی اصولوں سے بے جوڑ نہیں ہوتا یہ چیز نہ آپ موسائیٹ میں پائیں گے اور نہ مسیحیت میں اور نہ دنیا کے کسی اور دھرم یا مذہب میں۔ اس روشنی میں غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام ایک طرف تو ہماری ساری زندگی پر حاوی بھی ہے اور دوسری طرف اس میں دین اور دنیا کے الگ الگ دایرے بھی ہیں۔ ان میں سے ایک دایرہ کے اندر ہم پابند ہیں اور دوسرے دایرہ کے اندر ہم آزاد۔

یہی دایرہ جس کے اندر ہم آزاد ہیں قرآن کے بعض مقامات اور متعدد احادیث میں دنیا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دنیا کا لفظ عام طور پر تو آخرت کے مقابل میں آتا ہے اور اس وقت اس سے عالم باقی کے مقابل میں یہ عالم فانی مراد ہوا کرتا ہے۔ لیکن جب اس خاص مفہوم میں استعمال ہوتا ہے تو یہ لفظ دین کے مقابل میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اس وقت اس سے مراد ہماری زندگی کا وہ دایرہ ہوا کرتا ہے جس کی چاروں حدیں متعین کر دینے کے بعد ہمیں اس میں آزادی بخشی گئی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:۔

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا

(۱۵، لقمان)

اور اگر تمہارے والدین اس بات کے درپے ہوں کہ تم کسی ایسے کو میرا شریک بناؤ جس کے بارے میں تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو تم ان کی بات نہ مانو لیکن دنیوی معاشرت کے دایرہ میں ان کے ساتھ دستور کے مطابق سلوک کرتے رہنا۔

اس آیت میں فی الدنیا کا لفظ دین کے مقابل میں استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد ہماری معاشرتی زندگی کا وہ دایرہ ہے جس کے اندر خدا نے ہمیں آزاد چھوڑا ہے، کسی حکم یا ممانعت کے ذریعہ سے ہماری آزادی پر کوئی پابندی عاید نہیں کر دی ہے۔ اس دایرہ میں ہمیں ہدایت ہے کہ ہم والدین کے ہر حکم کی اطاعت کریں کیونکہ یہاں ان کی اطاعت اور خدا کی اطاعت میں کسی تصادم کا اندیشہ نہیں ہے۔ تابیر نخل والی مشہور حدیث میں حضورؐ نے یہ جو ارشاد فرمایا:۔

اَنتم اعلم بامور دنیاکم

تم اپنی دنیا کے معاملات کو زیادہ بہتر جانتے ہو۔

اس سے ہماری زندگی کا یہی دایرہ مراد ہے۔

اب مذکورہ بالا سوال کے دوسرے حصہ پر آیئے۔ یعنی اس سوال پر کہ ہمارے دین اور ہماری دنیا کے درمیان وہ حد فاصل کیا ہے جو ان دونوں دایروں کو اس طرح ایک دوسرے سے نمایاں اور ممتاز کر دے کہ دونوں میں کوئی التباس اور اشتباہ باقی نہ رہ جائے تاکہ ہم اپنے اختیار اور اپنی آزادی کے استعمال میں حدود اللہ سے تجاوز کرنے کے مجرم نہ ٹھیریں بلکہ ٹھیک ٹھیک اسی دایرہ کے اندر اپنی آزادی استعمال کریں جس دایرہ کے اندر ہمیں اس کے استعمال کا حق ملا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دنیا سے مراد وہ معاملات ہیں جن کے بارے میں ہمیں خدا اور رسول کی طرف سے نفی یا اثبات کی صورت میں کوئی ہدایت نہ دی گئی ہو۔ اور دین سے مراد وہ امور و مسایل ہیں جن میں خدا اور رسول کی جانب سے نفی یا اثبات کی صورت میں کوئی ہدایت دی گئی ہو۔ یہ ہدایت خواہ قرآن کے ذریعے سے دی گئی ہو یا حدیث کے ذریعے سے یا قرآن و حدیث کے کسی اشارے یا کسی اجتہاد و استنباط سے نکلتی ہو۔ جس طرح کی بھی ہدایت ہو وہ جس امر سے متعلق موجود ہو وہ دین کا دایرہ ہے، اس میں ہمارے فکر و عمل کی آزادی بس اس حد تک ہے کہ ہم اچھی طرح جانچ پرکھ کر یہ دیکھ لیں کہ جو نص ہے وہ اپنے مفہوم و مدعا میں واضح ہے یا نہیں؟ جو حدیث ہے وہ ثابت ہے یا نہیں؟ اور جو استنباط یا اجتہاد پیش کیا گیا ہے وہ اپنی کوئی اساس رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر ان پہلوؤں سے اس میں کوئی ضعف نہیں ہے تو اس سے انحراف دین سے انحراف ہے۔

بدعت کا دایرہ یہی دایرہ ہے جس میں بغیر کسی شرعی دلیل کے محض اپنے جی سے کوئی اضافہ کر دینا اسلام کی اصطلاح میں بدعت ہے اور اس بدعت کو اسلام نے گمراہی اور ضلالت قرار دیا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ:۔

اما بعد، فان خیر الحدیث	یاد رکھو کہ بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین
کتاب اللہ وخیر الھدی ھدی	ہدایت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے۔ اور بدترین
محمد صلے اللہ علیہ وسلم وشر	چیزیں وہ بے جوڑ اضافے ہیں جو ان میں کر دیے جائیں

الامور محدثاتها وکل بدعۃ ضلالۃ	اس طرح کی ہر چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے

(ریاض الصالحین بحوالہ مسلم)

ایک دوسری حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یوں مروی ہے :۔

قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احدث فی امرنا ھذا مالیس منہ فھو رد (متفق علیہ)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی نئی چیز گھسائی جو اس میں کی نہیں ہے تو وہ شے مردود ہے۔

یہی بات مسلم شریف میں بایں الفاظ وارد ہوئی ہے :۔

من عمل عملا لیس علیہ امرنا فھو رد	جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کی تائید میں ہمارے دین کی کوئی دلیل نہیں ہے تو وہ بات مردود ہے۔

عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :۔

وایاکم ومحدثات الامور فان کل بدعۃ ضلالۃ (ترمذی، ابوداود)	اور بدعت کی باتوں سے بچو کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابغض الناس الی اللہ ثلاث۔ ملحد فی الحرم ومتبغ فی الاسلام سنۃ الجاھلیۃ ومطلب دم امرئ مسلم بغیر حق لیھریق دمہ (مشکوۃ بحوالہ بخاری)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین قسم کے آدمی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ غضب کے مستحق ہیں۔ ایک وہ شخص جو عین حرم میں کسی بے دینی کا ارتکاب کرے، دوسرا وہ شخص جو اسلام کے اندر جاہلی طریقہ گھسانے کی کوشش کرے، تیسرا وہ شخص جو ناحق کسی مسلمان کی جان کے درپے ہوتا کہ اس کا خون بہائے۔

بلال بن حارث مزنی رضؓ سے روایت ہے کہ :۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے

من احیا سنۃ من سنتی قد امیتت فان لہ من الاجر مثل اجور من عمل بھا من غیر ان ینقص من اجورھم شیئًا ومن ابتدع بدعۃ ضلالۃ لا یرضاھا اللہ ورسولہ فکان علیہ من الاثم مثل اثام من عمل بھا لا ینقص ذلک من اوزارھم شیئًا

(مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

میری سنتوں میں سے کوئی ایسی سنت زندہ کی جو ختم کر دی گئی تھی تو اس کو ان لوگوں کے برابر برابر اجر ملے گا جو اس پر عمل کریں گے، بغیر اس کے کہ ان عمل کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی واقع ہو۔ اور جس نے کوئی ایسی بدعت ضلالت ایجاد کی جو اللہ اور رسول کو پسند نہیں ہے تو اس کو اس پر عمل کرنے والوں کے برابر برابر گناہ ہوگا اور اس سے عمل کرنے والوں کے گناہ میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

دین کے دایرہ کے اندر اس نوع کی کسی مداخلت کے صاف معنی یہ ہیں کہ جو بات دین کی ہے وہ تو نکال باہر کی جائے اور اس کی جگہ یہ نوایجاد چیز لے لے جس کے لیے دین میں کوئی سند نہیں ہے۔ اس وجہ سے ایک بدعت کرنے والے کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص اپنے ہاتھ کا گھر پھینک کر اس کے بجائے کوئی مینگنی اٹھالے یا اپنے ہاتھ کی مچھلی چھوڑ کر اس کی جگہ کوئی سانپ پکڑ لے۔ اس حقیقت کی طرف ایک حدیث میں حضورؐ نے یوں اشارہ فرمایا ہے:-

ما احدث قوم بدعۃ الا رفع مثلھا من السنۃ فتمسک بسنۃ خیر من احداث بدعۃ

(مشکوٰۃ بحوالہ احمد)

جس قوم نے کوئی بدعت ایجاد کی تو اسی کے مانند ان کے اندر سے ایک سنت اٹھالی گئی تو ایک سنت کو تھامے رکھنا ایک بدعت ایجاد کر لینے سے کہیں بہتر ہے۔

اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ بدعت دین کی تخریب کا دوسرا نام ہے۔ جو شخص ایک بدعت قائم کرتا ہے وہ گویا ایک سنت کو ڈھا دیتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام میں جس طرح بدعت کو ضلالت قرار دیا گیا ہے اسی طرح کسی صاحب بدعت کے ساتھ احترام اور محبت کے تعلق کو ہدم اسلام سے تعاون سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:-

من وقر صاحب بدعة فقد اعان علی ھدم الاسلام (مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی)

جس نے کسی صاحب بدعت کی عزت کی تو گویا اس نے اسلام کے ڈھانے میں تعاون کیا۔

اس تفصیل سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ بدعت کا مفہوم کیا ہے؟ یہ ہماری زندگی کے کس دایرہ کے اندر ظہور کرتی ہے؟ شریعت میں یہ کس درجہ کا جرم ہے؟ اور یہ کس طرح علم حق کے آثار اور اس کی نشانیوں کو مٹانے والی ہے۔ اب آگے ہم اس کے اسباب پر روشنی ڈالیں گے۔

بدعت کے دو بڑے سبب ہمارے نزدیک بدعت کے بڑے سبب دو ہیں۔ ایک غلو پسندی اور دوسرے خواہشات نفس کے لیے شرعی جواز پیدا کرنے کی خواہش۔ اب ہم ان دونوں اسباب کی کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت کرتے ہیں:-

غلو پسندی انسان کے اندر یہ ایک عام کمزوری پائی جاتی ہے کہ جن چیزوں کے ساتھ اس کا تعلق محض عقلی ہی نہیں بلکہ جذباتی بھی ہوتا ہے ان کے معاملے میں وہ بسا اوقات غیر متوازن اور غیر معتدل ہو جایا کرتا ہے۔ آدمی اپنی بیوی بچوں سے محبت کرتا ہے تو صرف محبت ہی نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات اس محبت میں ایسا اندھا ہو جاتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ عداوت بھی کرنے لگتا ہے، یہاں تک کہ اس اندھے پن میں اس کو خدا کے حقوق کا بھی کچھ ہوش نہیں رہ جاتا ہے۔ اگر اسے اپنے قبیلہ یا قوم یا ملک سے محبت ہے تو ان کی عصبیت اس پر بسا اوقات اتنی غالب آجاتی ہے کہ وہ ان کے لیے پوری انسانیت کا دشمن بن جاتا ہے، حد یہ ہے کہ ان کی حمایت میں خود خدا سے بھی لڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یہی چیز مذہب کے دایرہ میں آکر اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے کیونکہ مذہب کے ساتھ اولاً تو عام لوگوں کا تعلق عقلی کم اور جذباتی زیادہ ہوتا ہے اور اگر عقلی ہوتا بھی ہے تو بھی اس معاملے میں انسان کے جذبات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ عقل کے لیے ان کو ضبط میں رکھنا آسان کام نہیں ہوتا۔ یہ جام و سندان کی بازی کھیلنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے۔ چنانچہ اس دایرہ کے اندر ایسا بہت ہوتا ہے کہ آدمی کو جس حد پر رک جانا چاہیے وہاں آکر وہ نہیں رکتا، بلکہ اس حد کو لانگ کر آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ اگر ایک شخص اس کا مرشد ہے تو وہ اس کو مرشدی کے درجہ پر نہیں رکھے گا بلکہ اس کی خواہش یہ ہوگی کہ وہ کسی طرح اس کو رسالت کے مرتبہ پر فایز کر دے۔ اسی طرح اگر ایک ذات کو خدا نے منصب رسالت سے سرفراز فرمایا ہے تو یہ اپنے جوش عقیدت میں

یہ چاہے گا کہ اس کو خدا کی صفات میں بھی کچھ نہ کچھ شریک کر دے۔ اگر اس سے کسی کام کا مطالبہ پاؤ سیر کیا گیا ہو تو وہ چاہے گا کہ اس کو بڑھا کر سیر بھر کر دے۔ اس غلو پسندی نے دنیا میں بڑی بڑی بدعتوں کی بنیادیں ڈالی ہیں۔ اسی کے سبب سے عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنایا۔ اسی کے سبب سے انہوں نے اپنے صوفیوں اور عالموں کو ارباباً من دون اللہ کا درجہ دیا اور یہی چیز تھی جس نے ان کو رہبانیت کے فتنہ میں مبتلا کیا۔ چنانچہ قرآن نے ان کی اس غلو پسندی پر کئی جگہ ان کو ملامت کی ہے۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۡ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ڟ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۭ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ؀ (۱۷۱۔ نساء)

اے اہل کتاب اپنے دین کے معاملے میں غلو نہ کرو اور اللہ پر کوئی ایسی بات نہ لگاؤ جو حق نہ ہو۔ مسیح عیسیٰ بن مریم تو بس اللہ کے ایک رسول اور اس کے ایک کلمہ ہیں۔ اس کلمہ کو اس نے مریم کے اندر ڈالا اور اس کی طرف سے ایک روح ہیں، تو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ خدا تین ہیں۔ اس سے باز آؤ، یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی معبود ہے، وہ اس عیب سے پاک ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو، اسی کے قبضے میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کافی ہے بھروسہ کے لیے۔

اللہ کی رضا جوئی ہر دین میں بحیثیت اصلی نصب العین کے پیش نظر رہی ہے اور اس نصب العین تک پہونچنے کے لیے ہر مذہب نے ایک معتدل اور متوازن پروگرام جو قوم کے مناسب حال ہو، خود تجویز کر دیا ہے۔ یہ پروگرام نصاریٰ کے پاس بھی موجود تھا اور وہ اس پر کاربند ہو کر اس نصب العین کو حاصل کر سکتے تھے لیکن ان کے علماء اور صوفیا، اتنے ہی پر قانع نہیں ہوئے جتنا حضرت مسیح علیہ السلام ان کو بتا گئے تھے۔ بلکہ انہوں نے اپنی حد اس سے آگے بڑھ کر قائم کرنے کی کوشش کی۔ اور اس کوشش میں انہوں نے رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ قرآن نے ان کی اس بدعت کا ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے:۔

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا

(۲۷، حدید)

اور رہبانیت جس کی بدعت انہوں نے خود ایجاد کی ہم نے یہ چیز ان کے اوپر فرض نہیں کی۔ ان کے اوپر جو چیز فرض کی گئی وہ تو صرف خدا کی رضا جوئی تھی۔ لیکن انہوں نے اس کے حدود کو پوری طرح ملحوظ نہ رکھا (اور رہبانیت میں مبتلا ہو گئے)

مسلمانوں کو اس غلو پسندی کی بیماری سے بچانے کے لیے ایک طرف تو نصاریٰ کی تاریخ سنائی گئی کہ وہ کس طرح اس بیماری کے سبب سے بدعتوں میں مبتلا ہوئے اور پھر اس کے نتیجے میں دین حق کی نعمت سے محروم ہوئے۔ دوسری طرف قرآن و حدیث دونوں میں ان کو افراط و تفریط سے بچتے ہوئے صحیح نقطۂ اعتدال پر قائم رہنے کی تاکید کی گئی چند احادیث ملاحظہ ہوں:-

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تین جماعتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے پاس آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا حال پوچھنے آئیں۔ جب ان کو آپ کی عبادت کا حال بتایا گیا تو انہوں نے اس کو اپنے گمان اور توقع سے بہت کم پایا۔ وہ بولے کہ ہمارا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقابلہ؟ آپ کے تو تمام اگلے اور پچھلے گناہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب بولے میں تو رات رات بھر نمازیں پڑھا کروں گا۔ دوسرے صاحب نے کہا میں برابر روزے رکھا کروں گا کبھی ناغہ نہ کروں گا۔ تیسرے صاحب نے فرمایا کہ میں عورتوں سے ہمیشہ دور رہوں گا کبھی شادی نہ کروں گا۔ اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ آپ نے فرمایا تمہی لوگ تھے جو یہ یہ باتیں کر رہے تھے؟ خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور اس کے حدود کا پاس کرنے والا ہوں لیکن روزے بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور شادی بیاہ بھی کرتا ہوں۔ تو جس نے میرے طریقے سے انحراف اختیار کیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔" (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم و بخاری)

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً بعض کام کیے پھر آپ نے ان کے بارے میں لوگوں کو رخصت دیدی۔ کچھ لوگوں نے اس رخصت سے فایدہ

اٹھانا کچھ اچھا نہیں سمجھا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہونچی تو آپؐ نے ایک خطبہ دیا جس میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا: بعض لوگوں کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسی چیزوں کے کرنے سے احتراز کرتے ہیں جو میں خود کرتا ہوں؟ خدا کی قسم میں ان سے زیادہ اللہ کو جاننے والا ہوں اور ان سے زیادہ اس کا ڈر رکھتا ہوں"

(مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم)

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ دین کے معاملے میں اپنے اوپر سختی نہ کرو کہ اللہ بھی تم پر سختی کرے۔ ایک گروہ نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی یہ انہی کے بقایا ہیں جن کو تم گرجوں اور خانقاہوں میں دیکھ رہے ہو، پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَ رَهْبَانِيَّةِ ابْتَدَعُوهَا الآیۃ (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد)

اس آخری حدیث کے یہ الفاظ کہ "تم دین کے معاملے میں سختی نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر سختی کرے" ایک نہایت اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں کو نیکی اور تقویٰ کے انہی پیمانوں سے ناپنا چاہتا ہے جو اس نے خود مقرر کر دیے ہیں لیکن اگر کوئی شخص ان پیمانوں کو حقیر ٹھہرائے اور خود اپنی ایجاد سے کچھ نئے پیمانے بنائے جو اس کے زعم میں خدا کے پیمانوں سے بڑے ہوں تو پھر خدا بھی اس کو ان ہی پیمانوں سے ناپے گا اور اگر وہ خود اپنے ہی مقرر کیے ہوئے پیمانوں پر پورا نہیں اترے گا تو پھر بغیر کسی رعایت کے اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جس کا وہ مستحق ہو گا۔ اگر کسی شخص نے زہد، توکل، صبر، رضا اور محبت وغیرہ کے ایسے معیارات بنا لیے ہیں جو خدا اور رسول کے مقرر کیے ہوئے معیارات سے اونچے ہیں تو وہ انہی معیارات سے جانچا جائے گا اور اگر ان پر پورا نہ اترے گا تو کھوٹا قرار پائے گا۔ یہ مطلب ہے اس بات کا کہ "انہوں نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی"۔

لیکن ان نہایت واضح تاکیدات و تنبیہات کے باوجود مسلمانوں کے اندر بھی غلو پسندی کی یہ بیماری پھیلی اور اس سے ہمارے فکر و عمل کے ہر گوشے میں مختلف قسم کی بدعتیں داخل ہو گئیں۔ اس سے عقاید بھی متاثر ہوئے، احکام و قوانین بھی متاثر ہوئے اور عبادات و اخلاق بھی اس کی زد میں آئے۔

عقاید و نظریات میں یہ فتنہ بیشتر علم کلام کی راہ سے گھسا اور عبادات و اخلاق میں زیادہ تر تصوف

کی راہ سے۔ اس طرح کی ساری چیزوں پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کی یہاں گنجایش نہیں ہے۔ ہم صرف مثال کے طور پر اشاعرہ کے جبر، معتزلہ کے نظریۂ اختیار، معطّلہ اور مجسّمہ کے نظریات تعطیل و تجسیم اور حضرات صوفیہ کے نظریۂ وحدت الوجود کی طرف اشارہ کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ نجات کے معاملے میں خوارج کی تنگ گیری اور مرجیئہ کی بے قیدی اور اباحت بھی اسی ذیل میں شمار کیے جانے کے لیے لایق ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو خلقِ قرآن کے جس فتنہ کے سبب سے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اسی طرح فقہ میں بعض خود ساختہ اصولوں کو اساس بنا کر تخریج در تخریج کا جو سلسلہ شروع ہوا اور خیالی صورتیں فرض کر کر کے جو مسایل پیدا کیے گئے اس کے سبب سے ہماری فقہ میں ہر باب کے تحت ایسی بے شمار جزئیات داخل ہو گئیں جو زندگی کو بالکل تنگ کر دینے والی اور آدمی کے فکر و عمل کی آزادی کو بالکل سلب کر لینے والی ہیں۔ جو باتیں شریعت نے ہر آدمی کی سمجھ بوجھ پر چھوڑی تھیں اور جن میں وہ اپنی عقل سے کام لے کر ان کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو بھی اختیار کر سکتا تھا ان کی ایک خاص شکل معین کر دی گئی اور اس کو اس درجہ اہمیت دے دی گئی کہ اس سے معمولی انحراف خود دین سے انحراف سمجھا جانے لگا۔

اس غلو پسندی کا سب سے زیادہ مظاہرہ ان مسائل میں ہوا ہے جو مختلف فقہی مذاہب میں کسی سبب سے مابہ النزاع بن گئے ہیں۔ یہ مسائل ہیں تو عموماً بالکل جزوی اور فروعی نوعیت کے لیکن ہر مسلک کی کتابوں میں اتنی شد و مد سے ان پر بحثیں ہوئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کے اصلی مسائل یہی ہیں اور انسان کی نجات کا تمام تر انحصار انہی کے اختیار کرنے یا نہ کرنے پر ہے۔ یہ بحثیں ہر مسلک کے حامیوں کی طرف سے تصنیفات و تالیفات میں بھی پورے زور و قوت کے ساتھ اٹھائی گئی ہیں اور انہی پر ایک ایک مسجد اور ایک ایک مدرسہ میں آئے دن مناظرہ کی مجلسیں بھی گرم ہوتی رہتی ہیں بلکہ بسا اوقات ان کے سبب سے مسلمانوں کے اندر جنگ و جدل، تکفیر و تفسیق، گرفتاری و مقدمہ بازی اور قتل و آتش زنی تک نوبتیں پہونچتی ہیں۔

عبادات و اخلاق میں غلو کے سبب سے زیادہ تر بدعتیں تصوف کی راہ سے آئی ہیں۔ صوفیہ نے تزکیۂ نفس، تقربِ الٰہی اور ذکر و عبادت کی بعض ایسی صورتیں ایجاد کی ہیں جن کا کتاب و سنت میں کوئی نشان نہیں ملتا ہے۔ پُر مشقت ریاضتیں، چلہ کشی اور عملیات کی ان کے ہاں ایسی مثالیں موجود ہیں جن کا دین میں بہتر ہونا تو درکنار

ان کا جواز بھی مشکل سے ثابت کیا جا سکتا ہے اور ان میں سے بعض کے بدعت ہونے میں تو کسی شبہ کی گنجایش ہی نہیں۔ میں نے ایک مرتبہ خود ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔ ذاتِ رسالت کے ساتھ عقیدت و محبت کے اظہار کا ایک بڑا ذریعہ ان میں سے بہتوں کے ہاں صرف قوالی ہے اور اس میں بے دھڑک ایسے اشعار گائے جاتے ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ العیاذ باللہ خود اللہ تعالیٰ سے بڑھا دیا جاتا ہے۔

ممکن ہے کسی کو خیال ہو کہ اس طرح کی چیزیں صرف بدعت پسند صوفیوں ہی کے ہاں پائی جاتی ہیں، جو صوفیہ کتاب و سنت پر عامل ہیں ان کے ہاں اس طرح کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ یہ خیال اگر حقیقت کے مطابق ثابت ہو جائے تو مجھے اس سے نہایت خوشی ہوگی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں تصوف کا جو حصہ پاکیزہ ہے بعض چیزیں اس میں بھی ایسی ملتی ہیں جن کے بدعت ہونے میں کسی کلام کی گنجایش نہیں ہے۔ مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ تصورِ شیخ کو محبتِ الٰہی کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور ہمارے صوفیانہ لٹریچر میں اس کی جو توجیہ عموماً کی گئی ہے اس کی روشنی میں یہ کتاب و سنت کے صریح خلاف نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے قائل بعض ایسے لوگ بھی ہیں جن کے لائقِ احترام ہونے سے کوئی شخص بھی اختلاف نہیں کر سکتا۔

صوفیانہ لٹریچر میں اس غلو کا سب سے زیادہ مظاہرہ اس حصے میں ہوا ہے جہاں یہ حضرات صبر، شکر، زہد، قناعت، توکل، انابت، عبودیت، خشیت اور محبت و رضا وغیرہ کی حقیقتیں بیان کرتے ہیں۔ یہ بحثیں آپ تصوف کی کسی قابلِ اعتماد کتاب میں پڑھیے۔ میں اس کے لیے رسالہ قشیریہ، یا قوت القلوب یا امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی احیاء العلوم کے پڑھنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ یہ کتابیں صوفیانہ لٹریچر میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اصلاحِ نفس کے نقطۂ نظر سے ان کتابوں کو پڑھنا اور بار بار پڑھنا نہایت ضروری ہے۔ ان کتابوں میں جب آدمی ان مباحث کو پڑھتا ہے تو پہلی نظر میں ان کی دل کشی آدمی کو مسحور کر لیتی ہے لیکن جب آدمی ان کا تجزیہ کرنے بیٹھتا ہے اور یہ چیز بھی اس کے پیشِ نظر ہوتی ہے کہ ان کو عملی زندگی میں اپنانا بھی ہے تو پھر وہ اکثر جگہ یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ باتیں بڑی ہی اعلیٰ، بڑی ہی پاکیزہ اور بڑی ہی زرین ہیں لیکن ان کو اپنانا صرف ان بزرگوں ہی کا کام تھا جنھوں نے یہ لکھی ہیں یا جو گذر چکے ہیں۔ اس زمانے کے انسان کا یہ ظرف

نہیں ہے کہ وہ ان مقامات تک پہونچ سکے۔ بلکہ بعض اوقات وہ یہ رائے قایم کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ انسان اپنے بشری تقاضوں سے دست کش ہوئے بغیر شاید ان کو اپنا ہی نہیں سکتا۔ علامہ ابن قیمؒ نے مدارج السالکین میں سلوک کے مقامات پر سیر حاصل بحث کی ہے اور جگہ جگہ یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر فلاں چیز کی حقیقت یہ ہے جو ارباب تصوف پیش کرتے ہیں تو پھر اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اس مقام کو صحابہ بلکہ انبیاء بھی حاصل نہ کر سکے۔

ابن قیمؒ کی مدارج السالکین، جیسا کہ میں اوپر کہیں عرض کر چکا ہوں، ایک مشہور صوفی شیخ ابو اسمٰعیل ہروی کی کتاب منازل السایرین کی شرح اور اس پر ایک قسم کا تبصرہ ہے۔ شیخ ابو اسمٰعیل نے توبہ، توکل، صبر، رضا وغیرہ کی شرح میں یہ طریق اختیار کیا ہے کہ ہر چیز کے وہ تین درجے بیان کرتے ہیں۔ (ہم اس کی بعض مثالیں اس کتاب کی پچھلی فصلوں میں نقل کر آئے ہیں) پہلا درجہ عوام کا، دوسرا درجہ خواص کا، تیسرا درجہ اخص الخواص یا بالفاظ دیگر کاملین و عارفین کا۔ عموماً ..... پہلے درجے ہی کا معیار وہ ایسا بلند قایم کرتے ہیں کہ آدمی یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ قرآن آدمی کو جہاں تک لے جانا چاہتا ہے وہ تو بس یہیں تک ہے اور اگر اس میں کسی پہلو سے کوئی کسر ہے تو دوسرے میں تو وہ بہرحال پوری ہو جاتی ہے۔ رہا تیسرا درجہ تو وہ صاف ایک مافوق بشریت درجہ معلوم ہوتا ہے جو شیخ کے نزدیک تو کاملین کا درجہ ہوتا ہے لیکن اگر کوئی شخص کتاب و سنت کو معیار کامل مان کر اس کا تجزیہ کرے تو عموماً اس کے متعلق وہ یہ رائے قایم کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس درجے یا اس مقام کا اگر کوئی وجود ہے تو وہ صرف شیخ کے ذہن میں ہے۔ نہ کتاب و سنت میں اس کا کوئی اشارہ ملتا ہے اور نہ عقل اور قیاس کی وہ گرفت میں آتا ہے۔ یہ صورت حال آدمی کو سخت حیرانی میں ڈال دیتی ہے۔ اگر وہ یہ مانے کہ یہ ایک مقام ہے تو سہی لیکن کتاب و سنت میں اس کا بیان اس وجہ سے نہیں ہوا ہے کہ وہ صرف متوسط درجہ کے لوگوں ہی کی تعلیم کے لیے ہیں، جیسا کہ صوفیہ کے ایک گروہ کا خیال ہے، تو اس پر کسی ایسے شخص کا دل مطمئن نہیں ہوتا جو کتاب و سنت اور انبیائے کرام ہی کو معیار کامل مانتا ہے۔ اگر وہ خیال کرے کہ اس درجہ کا بیان تو کتاب و سنت میں ہوا ہے لیکن "لکل ظہر بطن" کے صوفیانہ نظریہ کے مطابق یہ حقایق کتاب و سنت کے پردوں میں اس طرح چھپے ہوئے ہیں کہ ان تک صرف خاص خاص لوگ ہی پہونچ سکے ہیں، قرآن کے الفاظ سے ان تک رسائی نہیں حاصل کی جا سکتی تو اس سے بھی دل کو اطمینان نہیں ملتا کیونکہ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس نظریہ اور باطنیت کے

درمیان فرق کیا ہے؟ اگر وہ یہ فرض کرے کہ یہ معیارات بتائے اور سکھائے ہوئے تو انبیائے کرام ہی کے ہیں لیکن امت میں ان کے منتقل ہونے اور پھیلنے کے ذریعے سفینے نہیں بلکہ خواص کے سینے ہیں تو یہ چیز اور بھی متوحش کرتی ہے کیونکہ یہ چیز پورے نظام دین ہی کو ڈھا دیتی ہے۔ اگر وہ مانے کہ ان کے معلوم کرنے کا ذریعہ وحی نہیں بلکہ کشف ہے تو اس سے اور بھی الجھن بڑھتی ہے کیونکہ کسی کشف کو وحی کی کسوٹی پر جانچے بغیر بجائے خود سند مان لینا اسی شخص کے لیے ممکن ہے جو اپنے دین و ایمان کے معاملے میں اتنا بے پروا ہو کہ وہ ان کو ہر خواب اور ہر وسوسہ پر قربان کر سکتا ہو۔

اگر ان تمام باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں مانی جا سکتی تو آخر اس کے سوا کیا چارہ کار ہے کہ آدمی یہ مانے کہ جس مقام کی تشریح و توضیح میں کتاب و سنت کے قایم کردہ معیار سے تجاوز کیا گیا ہے یہ محض غلو کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ جگہ جگہ علامہ ابن قیمؒ نے تنقید کر کے دکھایا ہے کہ شیخ ابو اسمٰعیل کے قایم کردہ معیارات کتاب و سنت کے معیارات سے اونچے ہیں اور چونکہ صحیح انسانی فطرت کے مطابق معیارات وہی ہو سکتے ہیں جو کتاب و سنت میں قایم کیے گئے ہیں اس وجہ سے لازماً یہ معیارات غلط ہیں۔ اس غلو کے سبب سے صوفیائے کرام کے ان معیارات سے یا تو آدمی پر مایوسی طاری ہو جاتی ہے اور وہ ان کو اپنانے کی ہمت ہی نہیں کرتا یا اگر کرتا ہے تو علمی پہلو سے وہ تفلسف اور باطنیت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اور عملی پہلو سے جوگ اور رہبانیت کا۔ علم و معرفت کی بحث میں میں ابو اسمٰعیل ہروی کی کتاب سے چند اقتباسات اوپر پیش کر آیا ہوں۔ وہ میرے خیال کی تائید کے لیے کافی ہیں۔ اگر کسی کو یہ اعتراض ہو کہ یہ تو تصوف کے صرف ایک خاص اسکول کی ترجمانی ہوئی، دوسرے صوفیاء کرام کا طرز فکر اس سے مختلف ہے تو میری جانب سے اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ جن صوفیائے کرام کا طرز فکر اس سے مختلف ہے، جو کتاب و سنت ہی کو معیار کامل مانتے ہیں مجھے ان پر اعتراض نہیں ہے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ کوئی ایسی کتاب منتخب کیجیے جس میں ہر مکتب خیال کے صوفیوں کی ترجمانی کی گئی ہو اور اس کو اس نقطۂ نظر سے پڑھیے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے پھر دیکھیے کہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ کس حد تک صحیح ہے۔ میرے خیال میں اس مقصد کے لیے رسالہ قشیریہ ایک موزوں کتاب ہے۔ اس میں ہر باب کے تحت تقریباً اکثر اکابر تصوف کے اقوال و افکار موجود ہیں۔ اس کو تنقید کے ساتھ پڑھیے تو اس میں بھی قدم قدم پر وہ

بے اعتدالی موجود ملے گی جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ میں اس کتاب سے بعض مثالیں پیش کر کے اپنے نقطۂ نظر کو مدلل طور پر واضح کر سکتا ہوں لیکن چونکہ آگے یہ ساری بحثیں تزکیۂ عمل اور تزکیۂ تعلقات و معاملات کے ابواب میں تفصیل کے ساتھ آ رہی ہیں اس وجہ سے یہاں بیچ راستہ میں میں ناظرین کو روکنا نہیں چاہتا۔

خواہشاتِ نفس کی پیروی بدعت کا دوسرا سبب خواہشاتِ نفس کی پیروی ہے۔ انسان کے اندر یہ بڑی کمزوری ہے کہ بسا اوقات وہ ایک نظریہ یا ایک رویہ اختیار تو اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اس کی خواہشاتِ نفس کے مطابق ہوتا ہے، اس سے اس کے کسی مخفی منصوبے کی تکمیل ہو رہی ہوتی ہے، اس سے کسی ایسے شخص کی خوشنودی اسے حاصل ہوتی ہے جس کی خوشنودی اسے اپنے دنیوی اغراض کے نقطۂ نظر سے مطلوب ہوتی ہے، اس سے اس کے وہ ارمان پورے ہوتے ہیں جو نفس کی اکساہٹ سے اس کے اندر ہر وقت گدگدیاں پیدا کر رہے ہوتے ہیں لیکن وہ اتنی جرأت و ہمت نہیں رکھتا کہ ان چیزوں کی تکمیل کے لیے وہ صاف صاف نفس پرستی اور دنیا پرستی کے نام سے میدان میں اترے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی اس دنیاداری اور نفس پرستی کے لیے دین داری کی کوئی آڑ بھی تلاش کر لے تاکہ رند کا رند بھی رہ سکے اور ہاتھ سے جنت بھی نہ جانے پائے۔ اس خواہش کے تحت وہ مختلف قسم کے نظریات بناتا ہے اور ان کو مذہب کے اندر گھسانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر گھسانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر ان سے اپنی خواہشوں کے بند دروازوں کے کھولنے میں کلید کا کام لیتا ہے، خواہشاتِ نفس کے تحت فتویٰ لکھتا ہے اور ان کو کتاب و سنت کی طرف منسوب کرتا ہے محض سفلی جذبات کی تسکین کے لیے بہت سے کام کرتا ہے اور ان کو معرفتِ الٰہی اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ بناتا ہے۔

یہود نے جب چاہا کہ اپنی نفس پرستیوں کے لیے کوئی شرعی سند جواز پیدا کریں تو انہوں نے یہ نظریہ بنایا کہ ہم چونکہ حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ کی اولاد اور خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں اس وجہ سے ہم خواہ کچھ بھی کریں ہمارے لیے دائمی عذابِ دوزخ نہیں ہے، اول تو ہم دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی جائیں گے تو چند دنوں سے زیادہ کے لیے نہیں۔ اپنے اس نظریے کو جو محض نفس پرستی کی تحریک سے پیدا ہوا تھا انہوں نے اپنے دین میں گھسا دیا اور جب گھسا دیا تو ظاہر ہے کہ ان کی ساری شریعت ان کی خواہشوں کے سانچے میں ڈھل گئی۔ اس کے اندر جو حقوق اور جو درجے اور مرتبے ان کے لیے بیان ہوئے تھے ان کا تو وہ اپنے آپ کو پورا پورا مورثی حق دار

سمجھتے تھے لیکن جو ذمہ داریاں اس میں بیان ہوئی تھیں ان کی سرے سے ان کو کوئی پروا ہی نہیں رہ گئی تھی، وہ اپنے مذکورہ نظریہ کی بدولت جزا و سزا اور دوزخ کی فکر سے بالکل فارغ البال ہو گئے تھے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کو اپنی خواہشوں کا ایک مجموعہ سمجھ رکھا ہے جس میں وہی باتیں لکھی ہوئی ہیں جن کو ان کا نفس پسند کرتا ہے۔

اسی طرح جب ان کے اندر سود کا رواج ہوا تو انہوں نے یہ نظریہ پیدا کیا کہ سود اگر حرام ہے تو خود اپنی قوم کے افراد یعنی بنی اسرائیل سے لینا حرام ہے نہ کہ دوسری کافر قوموں سے۔ اس نظریہ کو انہوں نے اپنے دین میں گھسایا اور پھر اس راہ سے انہوں نے اپنے سارے سودی کاروبار کو جائز کر لیا۔

اسی طرح عیسائیوں میں پال نے جب رومیوں میں عیسائیت کو مرغوب و مقبول بنانا چاہا تو اس نے سور اور شراب کو جائز قرار دے دیا اور اس کے لیے تاویل یہ کی کہ سور اور شراب کی حرمت اگر وارد ہے تو تورات میں وارد ہے نہ کہ انجیل میں اس وجہ سے بنی اسرائیل کے افراد کے لیے تو یہ چیزیں بے شک ناجائز ہیں لیکن دوسری قوموں کے جو لوگ مسیحیت قبول کریں ان کے لیے اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

مسلمانوں پر اتباع ہوا کے تحت بدعتوں کا حملہ مختلف طرف سے ہوا۔ سب سے زیادہ یہ جنس باطنیہ نے پیدا کی۔ انہوں نے شریعت کی تمام قیود سے اپنے آپ کو آزاد کر لینے اور خواہشات نفس کو پوری پوری چھوٹ دیدینے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ شریعت کی تمام اصطلاحات کا مفہوم ہی یک سر بدل کے رکھ دیا۔ ان کی تعریف کے لحاظ سے نہ نبی نبی رہا نہ قرآن قرآن اور نہ روزہ روزہ رہا اور نہ نماز نماز۔ ہر چیز کے ظاہر و باطن کو انہوں نے اس طرح مسخ کر دیا کہ شریعت کا پورا حلیہ ہی بگڑ کر رہ گیا۔ مثلاً نبی اس ذات کا نام ہے جس پر قوت قدسیہ کا فیضان ہو، معاد سے مراد ہر چیز کا اپنی حقیقت کی طرف لوٹ آنا ہے، جنابت سے مراد افشائے راز ہے، غسل سے مراد تجدید عہد ہے، زنا سے مراد علم باطن کے نطفہ کو کسی ایسی ہستی کی طرف منتقل کرنا ہے جو عہد میں شریک نہ ہو، طہارت سے مراد مذہب باطنیہ کے سوا ہر مذہب سے برأت ہے، صلوٰۃ سے مراد امام وقت کی طرف دعوت، زکوٰۃ سے مراد ذی صلاحیت لوگوں میں علم کی اشاعت ہے۔ فرقہ اسمٰعیلیہ اور بابیوں بہائیوں کا سارا نظام اسی طرح کے عجایب و غرایب پر کھڑا ہے۔ شیعوں کے ہاں متعہ اور اس طرح کی بعض دوسری چیزیں اسی قبیل سے تعلق

رکھتی ہیں۔ قادیانیوں نے بھی باطنیہ سے بہت کچھ لیا ہے۔

لیکن اس زمانہ میں باطنیہ کے حقیقی وارث منکرینِ حدیث ہیں۔ انہوں نے سنت کا انکار کرنے کے بعد تمام شرعی اصطلاحات۔ روزہ، نماز، حج، قربانی، جنت، دوزخ اور آخرت وغیرہ کی جو تاویلیں کرنی شروع کی ہیں، ان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کے مقصد اور باطنیہ کے مقصد ان کے طریقِ کار اور باطنیہ کے طریقِ کار میں سرِ مو فرق نہیں ہے۔ آپ باطنیہ کے نظریات و عقاید اور ان کے نظریات و عقاید، ان کی تاویلیں اور باطنیہ کی تاویلیں آمنے سامنے رکھ لیجیے تو یہ حقیقت آپ پر بالکل واضح ہو جائے گی کہ یہ دونوں ایک ہی اب وجد کی اولاد اور ایک ہی شجرۃ الزقوم کے برگ و بار ہیں۔

اسی اتباعِ ہوا کا ایک مظہر ہمارے بعض اہلِ علم کا یہ نظریہ ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے جرموں اور گناہوں کی سزا اللہ تعالیٰ اسی دنیا کے مصایب و شدائد کے ذریعہ سے پوری کر دیتا ہے، دوزخ کی سزا ان کے لیے نہیں ہے۔ نیز بے علم اور کم عقل عوام کے ساتھ آخرت میں وہ معاملہ ہوگا جو کیڑوں مکوڑوں کے ساتھ ہوتا ہے، ان کو جزا و سزا کی اس کسوٹی پر نہیں پرکھا جائے گا جس کا ذکر قرآن و حدیث میں ہوا ہے۔ یہ نظریہ یہودیوں کے اس نظریہ سے بالکل مشابہ ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ہم کو دوزخ کی آگ چند دنوں سے زیادہ نہیں چھوئے گی۔ اور اس نظریہ نے ان کو شریعت کی حدود توڑنے کے لیے بالکل بے خوف و بے باک بنا دیا تھا۔ اسی طرح ہمارے ان نئے متکلمین نے بھی یہ نظریات عوام کو ان کی بے خبری اور شریعت سے بے پروائی پر مطمئن رکھنے کے لیے ایجاد فرمایا ہے تاکہ لوگ جس غلط روش پر ہیں اس پر جمے رہنے کے لیے ان کو ایک عقیدہ کا سہارا فراہم کر دیا جائے۔ اور آخرت کی باز پرس کی جو خلش بعض اوقات ستاتی رہتی ہے اس سے کم از کم حیلہ جو طبیعتوں کو بالکل ہی رہائی مل جائے۔

رخصت کا فلسفہ بھی کم از کم اپنی موجودہ صورت میں اسی اتباعِ ہوا کا ایک مظہر ہے۔ دین کے اکثر مطالبات کے جواب میں آج بڑی آسانی کے ساتھ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ان مطالبات کے دین کے مطالبات ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہے لیکن حالات و مصالح کے تحت اسلام نے آخر رخصت سے بھی تو فایدہ اٹھانے کا حق دیا ہے؟ موجودہ زمانہ چونکہ ان باتوں کے لیے سازگار نہیں ہے اس وجہ سے جو کچھ ہو رہا ہے اسی کو گوارا کرنا چاہیے۔

حلقہائے تصوف سے وابستہ لوگوں کی جو بدعتیں اتباع ہوا کے تحت آئی ہیں وہ یوں تو بہت سی ہیں لیکن دو چیزیں بہت نمایاں ہیں ایک تو ساز کے ساتھ نغمہ کی بدعت دوسری یہ بدعت کہ بہت سے لوگ اس وسوسہ میں مبتلا ہو کر کہ وہ خدا رسیدہ ہو چکے ہیں اپنے آپ کو شریعت کی تمام پابندیوں اور ذمہ داریوں سے یک قلم آزاد کر لیتے ہیں۔ خانقاہوں اور مزارات پر عرسوں میں جو صریح منکرات ہوتی ہیں ان کا حوالہ میں اس وجہ سے نہیں دیتا کہ ان چیزوں کی ذمہ داری تصوف کے حامیوں کی طرف سے عوام پر ڈال دی جاتی ہے لیکن مذکورہ دونوں چیزوں کے متعلق تو یہ عذر کسی طرح نہیں کیا جا سکتا۔

فقہی طرز کی جو بدعتیں آج محض ہوا پرستی کی تحریک سے سامنے آ رہی ہیں ان کا ایک بہترین نمونہ عائلی کمیشن کی وہ رپورٹ ہے جو مسلمانوں کے ازدواجی مسایل سے متعلق حکومت کے ایک مقرر کردہ کمیشن نے پیش کی ہے۔ اس رپورٹ کے مرتبین نے دعویٰ تو قدم قدم پر یہ کیا ہے کہ اس میں انہوں نے جو سفارشات پیش کی ہیں وہ تمام تر کتاب و سنت پر مبنی ہیں لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ اس میں بیش تر مغربی ملکوں کے ازدواجی قوانین کی نقالی کی گئی ہے اور ان کو شریعت کے مطابق ثابت کرنے کے لیے شرعی احکام کو پوری بے باکی کے ساتھ توڑا مروڑا گیا ہے۔

علاج بدعت کے اسباب واضح ہو جانے کے بعد اس کا علاج خود بخود سامنے آ گیا۔ وہ یہ کہ آدمی پوری مضبوطی کے ساتھ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت پر قایم رہنے اور دوسروں کو بھی قایم رکھنے کا اہتمام و التزام کرے۔ جس چیز کی جو حد کتاب و سنت میں قایم کر دی گئی ہے اس میں نہ کوئی زیادتی کرے نہ کوئی کمی، جس کا جو مرتبہ شریعت میں متعین کر دیا گیا ہے اس سے اس کا مرتبہ نہ اونچا کرنے کی کوشش کرے نہ نیچا، جو چیز دین میں جتنی مقدار میں مطلوب ہے اس میں محض اپنے جی سے نہ کوئی اضافہ کرے نہ کوئی تخفیف۔

اسی طرح اپنی خواہشوں میں سے کسی خواہش کو شریعت کا جامہ پہنانے کی کوشش نہ کرے۔ اپنے من گھڑت نظریات کو دین میں نہ گھسائے، اپنے ذاتی میلانات و رجحانات کو قرآن و حدیث کے نام سے پیش کرنے کا خواہشمند نہ بنے۔

یہ کام کہنے میں آسان ہے لیکن کرنے میں بڑا مشکل ہے۔ اس زمانہ میں حالات اس قدر بگڑ چکے ہیں کہ شریعت نے جن چیزوں کو منکر قرار دیا ہے وہ سوسائٹی میں معروف بن چکی ہیں اور جن چیزوں کو شریعت نے معروف بتایا ہے

وہ منکر قرار دے دی گئی ہیں۔ اس فسادِ حال کے سبب سے اگر کوئی شخص صحیح سنت پر قایم رہنا چاہے تو وہ سوسائٹی میں بالکل نکو بن کر رہ جاتا ہے، ہر جگہ اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے، ہر مجلس میں وہ خود بھی اپنے آپ کو اجنبی اور بے گانہ محسوس کرتا ہے اور دوسرے بھی اس کو اجنبی اور بے گانہ محسوس کرتے ہیں۔ اور اگر اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اصلاح کی بھی کوشش کرے تو یہ بے گانگی فوراً اختلاف اور کشمکش کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پھر ہر جگہ اس کے خلاف ایک محاذِ جنگ قایم ہو جاتا ہے۔ یگانے اور بے گانے دونوں ہی اس سے الجھتے اور لڑتے جھگڑتے ہیں، عزیز اور دوست دشمن بن جاتے ہیں اور صرف وہی لوگ اس کے ساتھ رہ جاتے ہیں جو یا تو پہلے سے اس کے ہم خیال و ہم مسلک ہوں یا اس کی دعوت و تبلیغ سے متاثر ہو کر اس کے ہم خیال بن چکے ہوں۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنا معمولی عزم و ہمت کے آدمی کا کام نہیں ہے یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو دوسروں کی ناراضگیاں مول لے سکتے ہوں، جو حق کے لیے رشتوں اور قرابتوں سے بے پروا ہو سکتے ہوں، جو اللہ کے لیے ہر طرح کا نقصان گوارا کر سکتے ہوں اور جو بدعت کے مقابل میں سنت کی حمایت و نصرت کے لیے پہاڑ کی طرح مضبوط ہو کر کھڑے ہو سکتے ہوں۔

اس راہ میں آدمی کو سب سے زیادہ قیمتی رہ نمائی حضرات انبیاء علیہم السلام اور حضرات صحابہؓ کی زندگیوں کے عملی نمونوں سے ملتی ہے۔ اگر آدمی انبیاء اور صحابہ کے حالات کا برابر مطالعہ کرتا رہے تو بدعات سے لڑنے کے لیے اس کے اندر برابر حرارت قایم رہتی ہے۔ اس امت میں سنت کے اہتمام اور بدعت کی مخالفت کے پہلو سے صحابہؓ کے بعد میرے نزدیک سب سے اونچا درجہ حضرت احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ ان کی زندگی سراپا سنت ہے اور ان کا ایک ایک قول و فعل بدعت کے خلاف کھلم کھلا بغاوت۔ جب آدمی ان کے حالات کا مطالعہ کرتا ہے تو سنت کی حمایت اور بدعت کے مخالفت کے جذبہ سے اس کا دل سرشار ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اپنے اندر اس جذبہ کو زندہ رکھنا چاہیں میں ان کو حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی کا بار بار مطالعہ کرتے رہنے کا مشورہ دوں گا۔